معاملہ کرایہ داری کی شرعی حیثیت

از مولانا محمد طاسین، صدر مجلس علمی، کراچی

(تیسری اور آخری قسط)

اگر مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ معاملہ کرایہ داری کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے تو میں فوراً سوچا سمجھا یہ جواب دوں گا کہ میں اس کو شرعاً ناجائز بمعنی حرام نہیں باور کرتا بلکہ جائز بمعنی مکروہ یقین کرتا ہوں اور میری یہ رائے جس استدلال پر مبنی ہے اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

میں چونکہ اس حقیقت پر یقین رکھتا ہوں کہ قرآن مجید ایک جامع اور کامل ضابطۂ حیات اور دستورِ زندگی ہے، اس کے اندر وہ اصول کلیہ اور مبادیٔ عامہ بتمام و کمال موجود ہیں جن میں زندگی کے سب جزوی مسائل کے لئے اجمالی ہدایت و راہنمائی پائی جاتی اور غور و فکر کے ذریعے ان کی شرعی حیثیات کا تعین کیا جاسکتا ہے، اور پھر یہ اصول و مبادی جس طرح حیاتِ انسانی کے دوسرے شعبوں کے مسائل و معاملات سے متعلق موجود ہیں اسی طرح معاشی شعبہ سے متعلق معاملات و مسائل کے بارے میں بھی موجود ہیں جن کی روشنی میں ہر معاشی معاملے اور مسئلے کی شرعی حیثیت معلوم اور متعین کی جاسکتی ہے۔

چنانچہ معاشی معاملات کے جواز و عدمِ جواز اور درست و نادرست کے متعلق قرآن مجید میں جو اصولی کلیہ اور ضابطہ ہے وہ اس کی دو آیات میں بیان فرمایا گیا ہے۔ ایک سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۷۵ میں اور دوسری سورۃ النساء کی آیت نمبر ۲۹ میں۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۲۷۵ میں الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾

﴿اور اللہ نے معاملہ بیع کو حلال قرار دیا اور معاملۂ ربا کو حرام ٹھہرایا"۔

اور سورۃ النساء کی وہ آیت شریفہ درج ذیل ہے:

﴿ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ.....الآیۃ ﴾

"اے وہ لوگو! جو مشرف بہ ایمان ہو چکے ہو' تم آپس میں ایک دوسرے کے اموال باطل طریقہ سے نہ کھاؤ سوائے اس کے کہ وہ تجارت کا ایسا طریقہ ہو جس میں فریقین کی رضامندی پائی جاتی ہو"۔

پہلی آیت میں اگرچہ بظاہر دو خاص معاشی معاملات کی شرعی حیثیت کا بیان ہے یعنی یہ کہ بیع و شراء کا معاملہ حلال و جائز اور ربا کا معاملہ حرام و ممنوع ہے لیکن درحقیقت اس آیت میں عام معاشی معاملات کے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے متعلق ایک اصولی اور کلی ضابطہ بیان فرمایا گیا ہے۔ گویا یہ فرمایا گیا ہے کہ ہر وہ معاشی معاملہ جو اپنی حقیقت و ماہیت' اپنی روح و غرض اور اپنے عملی اثرات و نتائج کے لحاظ سے معاملۂ بیع کی طرح ہو وہ حلال و جائز اور ہر وہ معاشی معاملہ جو اپنی حقیقت و ماہیت' اپنی روح و اسپرٹ اور اپنے معروضی اثرات و نتائج کے لحاظ سے معاملۂ ربا کی مانند ہو وہ حرام و ناجائز ہے۔ اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ جو معاشی معاملہ بعض پہلوؤں سے بیع کے مشابہ اور بعض پہلوؤں سے معاملۂ ربا کے مماثل ہو وہ نہ معاملہ بیع کی طرح قطعی حلال و جائز اور نہ معاملہ ربا کی طرح قطعی حرام و ناجائز بلکہ دونوں کے بین بین ایک مشتبہ اور مکروہ معاملہ ہے جس کا نہ کرنا' کرنے سے بہتر ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا قرآنی آیت میں بیع اور ربا کا اس طرح ذکر ہے کہ گویا یہ دو معاملے عام طور پر متعارف اور جانے پہچانے معاملے ہیں جو نزول قرآن مجید کے وقت رائج العمل تھے اور عام لوگ ان کے مفہوم و مطلب سے آگاہ اور واقف تھے' البتہ وہ اس غلطی اور گمراہی میں مبتلا تھے کہ یہ دونوں ایک طرح کے معاملات ہیں جیسا کہ اس آیت کے پہلے جملے سے ظاہر ہوتا ہے جو اس طرح ہے: ﴿ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ﴾ یعنی "کہتے ہیں یا انہوں نے کہا کہ سوائے اس کے نہیں کہ بیع تو ربا ہی کی طرح ہے"۔ اس جملے سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں معاملہ بیع اور معاملہ ربا کا مفہوم و مطلب متعین طور پر موجود تھا اور وہ دونوں کو اچھائی و برائی میں یکساں سمجھتے تھے' ایک کے حلال اور دوسرے کے حرام ہونے کا فرق ان کو معلوم نہ تھا۔ لہٰذا آیت مذکور کے زیر بحث حصے میں ان کو بتلایا

گیا کہ یہ دو معاملے یکساں اور برابر نہیں ان کے درمیان بڑا فرق ہے۔ ایک یعنی معاملہ بیع حلال اور دوسرا یعنی معاملۂ ربا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کی خیر و بھلائی کی خاطر اول کو حلال و مشروع اور ثانی کو حرام و ممنوع ٹھہرایا ہے۔

معاملہ بیع و شراء کی وہ حقیقت جو عام طور پر جانی پہچانی اور پوری دنیائے انسانیت میں متعارف ہے وہ یہ ہے کہ ایک تاجر شخص لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے ان کے استعمال کی کوئی چیز اپنے سرمائے کے ساتھ ایک جگہ سے خرید تا اور دوسری جگہ فروخت کرتا ہے اور چونکہ اس نے خرید و فروخت کے سلسلہ میں جو دماغی و جسمانی سعی و محنت کی ہوتی ہے لہٰذا وہ اس کی وجہ سے اس قیمت سے کچھ زائد قیمت پر فروخت کرتا ہے جو اس نے خود ادا کی تھی اور یہ زائد قیمت اس کا نفع کہلاتی ہے چنانچہ خریدار جو قیمت ادا کرتا ہے اس کا کچھ حصہ اس قیمت کا عوض ہوتا ہے جو تاجر نے ادا کی تھی اور کچھ حصہ جو نفع کہلاتا ہے اس دماغی و جسمانی سعی و محنت کا عوض ہوتا ہے جو تاجر نے خرید و فروخت کے سلسلہ میں کی تھی۔ چنانچہ اگر بیع کا یہ معاملہ دیانتداری کے ساتھ صحیح صورت سے طے پائے تو ہر فریق کو اس کی چیز کا پورا عوض مل جاتا جو اس کا حق ہوتا ہے' تاجر کو اس کے سرمائے اور دماغی و جسمانی کام کا عوض قیمتِ فروخت کی شکل میں اور خریدار کو اس کی ادا کردہ قیمت کا عوض مطلوبہ مال و سامان کی شکل میں مل جاتا ہے۔ لہٰذا مختصر الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ معاملۂ بیع وہ معاملہ ہے جس میں ہر فریق کو اس کی چیز کا مادی عوض ضرور ملتا ہے جو اس کا حق ہوتا ہے اور چونکہ اس میں ہر فریق کو اس کا حق ضرور ملتا ہے لہٰذا وہ عدل کے مطابق ہوتا اور اس میں فریقین کی حقیقی رضامندی پائی جاتی ہے جو معاملہ کی صحت کے لئے شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔

معاملہ ربا کو لیجئے' اس کی وہ حیثیت جو عام طور پر متعارف اور جانی پہچانی ہے وہ قرض و دَین کا ایسا معاملہ ہے جس میں شروع سے ہی یہ طے ہوتا ہے کہ مقروض و مدیون فریق مقررہ وقت پر قرض و دین کے اصل مال کی ادائیگی کے ساتھ مدتِ قرض و دین کے مطابق کچھ زائد بھی لازماً ادا کرے گا۔ اس میں مقروض اپنے مُقرِض کو قرض کے اصل مال پر جو زائد ادا کرتا ہے اس کے عوض مقرض کی طرف سے مقروض کے لئے کوئی ایسی مادی شے موجود نہیں ہوتی جو قدر و قیمت کے لحاظ سے اس زائد مال کا بدل بن سکتی ہو۔ اسلام مدت اور

مہلتِ قرض کو ایسی چیز تسلیم نہیں کرتا جس کی وجہ سے مقرض زائد مال کا حقدار قرار پاتا ہو' لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ ربا کا معاملہ ایسا معاملہ ہے جس میں ایک فریق دوسرے کا مال بغیر عوض کے لیتا اور اس کی حق تلفی کا مرتکب ہوتا ہے جس کا دوسرا نام باطل اور ظلم ہے۔

اوپر معاملہ بیع اور معاملہ ربا کی جو حقیقت بیان کی گئی ہے اس کے مطابق معاشی معاملات کے جواز و عدم جواز اور حلال و حرام کا جو اصولی ضابطہ قرار پاتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی رو سے ہر وہ معاشی معاملہ حلال و جائز ہے جس میں ہر فریق کو اس کی چیز کا قدر و قیمت کے لحاظ سے عوض ملتا ہو جبکہ اس کے برعکس ہر وہ معاشی معاملہ حرام و ناجائز ہے جس میں ایک فریق کو اس کی چیز کا عوض نہ ملتا ہو اور اس کی حق تلفی ہوتی ہو۔ اسی طرح معاوضے کا ہر وہ معاشی معاملہ مشتبہ و مکروہ ٹھہرتا ہے جس میں فریقین کے حق کا صحیح اور پورا تعین نہ ہو سکتا ہو اور یہ مشکوک رہتا ہو کہ ہر فریق کی چیز کا عوض کیا اور کتنا ہے' لہٰذا اس کے اندر عوض کی ادائیگی میں کمی بیشی کا احتمال اور امکان ضرور رہتا ہو۔

اس اصولی ضابطے کی روشنی میں جب ہم کرایہ داری کے زیر بحث معاملے کا تحقیقی و تفصیلی جائزہ لیتے ہیں تو یہ معاملہ نہ تو کامل طور پر معاملہ بیع کی طرح کا معاملہ نظر آتا ہے اور نہ کامل طور پر معاملہ ربا کے مماثل و مشابہ دکھائی دیتا ہے بلکہ بعض پہلوؤں سے معاملہ بیع کے اور بعض پہلوؤں سے معاملہ ربا کی مانند نظر آتا اور دکھائی دیتا ہے۔ اس کی کچھ تفصیل یہ ہے کہ جس طرح معاملہ بیع میں فریقین کے مابین کسی چیز کی خرید و فروخت ہوتی ہے اسی طرح کرایہ داری کے اس معاملہ میں بھی فریقین کے مابین ایک چیز کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ کرائے کی چیز کا مالک اپنی چیز کرایہ دار کو دیتا ہے اور اس سے نقد وغیرہ کی شکل میں قیمت وصول کرتا ہے۔ گویا دونوں (معاملوں) میں فریقین کے درمیان دو چیزوں کا تبادلہ ہوتا ہے لیکن اس مشابہت کے باوجود کئی ایسی چیزیں بھی ہیں جو ان دو معاملوں کے درمیان نمایاں فرق و امتیاز کا باعث ہیں اور دونوں کو ایک دوسرے سے الگ اور جدا ظاہر کرتی ہیں مثلاً معاملہ بیع میں جس چیز کی خرید و فروخت ہوتی ہے وہ خارج میں اپنا وجود رکھتی ہے اور قابل قبضہ ہوتی ہے جبکہ معاملہ کرایہ داری میں جو چیز بھی خریدی جاتی ہے وہ خارج میں اپنا الگ مستقل وجود نہیں رکھتی اور قابل قبضہ نہیں ہوتی۔ یعنی کرایہ داری کے معاملہ میں

جس منفعت کی خرید و فروخت ہوتی ہے اس کا کرائے والی چیز سے ہٹ کر الگ اور مستقل وجود نہیں ہوتا بلکہ کرائے والی چیز کے ساتھ وجود ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ قابل قبضہ نہیں ہوتی' قابل قبضہ اس میں کرائے والی چیز ہوتی ہے جو اس میں بیچی خریدی نہیں جاتی وہ اپنے مالک کی ملکیت میں رہتی ہے' کرایہ دار کی ملکیت میں منتقل نہیں ہوتی۔ دوسری چیز جس کی وجہ سے معاملہ بیع اور معاملہ اجارہ یعنی کرایہ داری کے درمیان اہم فرق ہے وہ یہ کہ معاملہ بیع میں مبیع یعنی بیچی جانے والی چیز کی مقدار کا تعین ناپ تول اور گنتی کے معروف پیمانوں سے ہو سکتا اور ہونا ضروری ہوتا ہے تاکہ معاملہ صحیح طور پر عدل کے مطابق طے ہو' مطلب یہ ہے کہ جب تک یہ متعین نہ ہو کہ ناپ تول وغیرہ کے لحاظ سے بیچی جانے والی چیز کی کتنی مقدار کی کتنی قیمت ہے' عدل کے مطابق معاملہ طے نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ ایسی چیز کی خرید و فروخت سے بعض احادیث نبویہ میں منع کیا گیا ہے۔ ناپ تول وغیرہ کے ذریعے جس کی مقدار متعین و معلوم نہ ہو بلکہ مجہول ہو کیونکہ اس میں یہ احتمال رہتا ہے کہ کسی فریق کو اس کی چیز کا صحیح اور پورا عوض نہ ملے اور اس کی حق تلفی واقع ہو' حالانکہ معاملہ کرایہ داری میں مبیع کی مقدار ہمیشہ مجہول رہتی ہے۔ اس میں مبیع منفعت ہوتی ہے جو کرایہ دار کرائے والی چیز سے اٹھاتا ہے۔ اور منفعت ایک ایسی چیز ہے جس کی مقدار کا تعین کسی مادی پیمانے سے نہیں ہو سکتا نہ کسی ترازو پر اسے تولا' نہ کسی پیمانے سے اسے ناپا ماپا' اور نہ کسی آلے سے اس کو گنا جا سکتا ہے کیونکہ وہ ایک معنوی اور غیر مادی چیز ہے جس کی مقدار کا مادی پیمانوں سے اندازہ اور تعین نہیں ہو سکتا' بلکہ اس کے تعین کا واحد معیار وقت کو قرار دیا جاتا ہے مثلاً ایک مکان کے کرائے کا تعین' وقت کے لحاظ سے کیا جاتا ہے اگر ایک دن کا کرایہ مثلاً دس روپے ہو تو ہفتے کے ستر' مہینے کے تین سو اور سال کے تین ہزار چھ سو روپے مقرر کئے جاتے لیکن یہ واقعہ ہے کہ وقت کے معیار و پیمانے سے منفعت کی اس مقدار کا صحیح تعین نہیں ہو سکتا جو مکان میں رہائش سے کرایہ دار کو حاصل ہوتی اور جس کی وجہ سے مکان کی مالیت اور قدر و قیمت میں کمی واقع ہوتی ہے' کچھ واضح الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ کرایہ دار جب کرائے کی شے کو استعمال میں لاتا اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے تو استعمال ہونے سے اس شے کی مالیت اور قدر و قیمت میں جو کمی واقع ہوتی ہے اس کے عوض کرایہ

دار پر لازم آتا ہے کہ کرائے کی شے کے مالک کو کرایہ ادا کرے تا کہ واقع شدہ کمی کی تلافی ہو گویا کرائے کے جواز کا فلسفہ وہ کمی ہے جو استعمال سے کرائے والی شے کی مالیت اور قیمت میں واقع ہوتی ہے چنانچہ جو شے ایسی ہو کہ استعمال ہونے سے اس کی مالیت اور قدر و قیمت میں کچھ کمی نہ واقع ہوتی ہو یعنی کچھ عرصہ استعمال ہونے کے بعد جب اپنے مالک کی طرف لوٹتی ہو تو مالیت اور قیمت کے لحاظ سے پوری کی پوری لوٹتی ہو جیسے رائج الوقت سکہ اور کرنسی خواہ وہ کسی دھات مثلاً سونے چاندی تانبے وغیرہ سے بنے ہوئے ہوں یا کاغذی نوٹوں کی شکل میں ہوں ظاہر ہے کہ گھسنے اور پرانے ہونے سے ان کی قدر و قیمت میں کچھ کمی واقع نہیں ہوتی' اسی طرح مزروعہ زمین بھی ایسی چیز ہے جو کاشت کے لئے استعمال ہونے سے مالیت اور قیمت میں کم نہیں ہوتی جبکہ اس کو کھاد وغیرہ دی جاتی اور اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جاتی ہو۔ کون نہیں جانتا کہ ایک بیکار بنجر زمین کے مقابلہ میں کاشت شدہ زمین زیادہ قیمتی ہو جاتی ہے' غرضیکہ استعمال ہونے سے جن اشیاء کی مالیت و قیمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ایسی اشیاء کو از روئے اسلام کرائے پر لینا دینا قطعاً ناجائز اور حرام ہوتا ہے' بہرکیف جن چیزوں کی مالیت اور قدر و قیمت میں استعمال ہونے سے کمی واقع ہوتی ہے جیسے مکان' اس کے متعلق کرائے کا جواز تو ہے لیکن عدل کے مطابق صرف اس حد تک کہ کرائے کی مقدار اس کمی کے برابر ہو جتنی استعمال ہونے سے مکان کی مالیت و قیمت میں واقع ہوئی اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ سوائے وقت و زمان کے اور کوئی ایسا معیار اور پیمانہ نہیں جس کے ذریعے یہ معلوم ہو سکے کہ کرائے کی مقدار اس کمی کے برابر ہے یا اس سے کم اور زیادہ جو استعمال سے واقع ہوئی اور وقت کے پیمانے سے بھی اس کا صحیح یقینی تعین نہیں ہو سکتا کیونکہ استعمال سے کسی شے کی مالیت اور قیمت میں جو کمی واقع ہوتی ہے اس کا اصل سبب وہ طور طریقہ اور طرز عمل ہوتا ہے جو کرایہ دار' کرائے والی شے کے استعمال میں اختیار کرتا ہے۔ بے احتیاطی اور لاابالی پن سے چیز استعمال کی جائے تو تھوڑے وقت میں مثلاً ایک ماہ کے عرصہ میں اس کے اندر جو کمی واقع ہوتی ہے وہ اس کمی سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جو صحیح طریقہ سے احتیاط کے ساتھ استعمال کرنے سے چھ ماہ کے عرصہ میں واقع ہوتی ہے۔ مثلاً' ہم عام طور پر دیکھتے ہیں کہ ایک جیسے دو مکان دو مختلف کرایہ داروں کے

پاس ہوتے ہیں۔ ایک صحیح طریقہ سے احتیاط کے ساتھ استعمال کرتا ہے ہر چیز کا پوری طرح خیال رکھتا اور اچھی طرح سنبھالتا ہے اور دوسرا لاپرواہی اور بے احتیاطی کے ساتھ استعمال کرتا اور بے ڈھنگے پن سے رہتا ہے تو ایک سال کے بعد ان دونوں مکانوں کی حالت ایک دوسرے سے نمایاں طور پر مختلف ہوتی ہے اور اس کمی میں کھلا ہوا فرق دکھائی دیتا ہے جو ان کی قیمت میں واقع ہوتی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ وقت کو کمی کے تعین کا معیار اور پیمانہ قرار دینا درست نہیں کیونکہ مثال مذکور میں وقت برابر ہونے کے باوجود دونوں مکانوں کی مالیت و قیمت میں کمی واقع ہونے کی مقدار مختلف ہے۔ مطلب یہ کہ اگر وقت ہی واقع ہونے والی کمی کی مقدار کے تعین کا صحیح معیار و پیمانہ ہوتا تو مذکورہ دونوں مکانوں میں کمی کی مقدار برابر ہوتی کیونکہ دونوں کی مدت استعمال ایک سال تھی' نتیجہ یہ کہ کرایہ داری کے معاملہ میں جس چیز کی خرید و فروخت ہوتی ہے اس کی مقدار ہمیشہ مجہول رہتی ہے کسی معیار و پیمانے سے اس کا تعین نہیں ہو سکتا لہٰذا یہ معاملہ' بیع کے معاملہ سے کچھ مختلف ہو جاتا ہے اور اس کی شرعی حیثیت وہ نہیں ہو سکتی جو معاملہ بیع کی ہے۔

اس امر کی وضاحت کے بعد کہ معاملہ اجارہ بمعنی کرایہ داری' معاملہ بیع کے ساتھ کامل اور کلی مشابہت نہیں رکھتا بلکہ ناقص اور جزئی مشابہت رکھتا ہے' اب یہ دیکھنا ہے کہ کیا یہ معاملہ' ربا کے معاملہ کی طرح ہے یا اس سے مختلف ہے۔ چنانچہ جب ہم اس کو غور سے دیکھتے ہیں تو بعض پہلوؤں سے یہ معاملہ ربا کے معاملہ سے متغائر و مختلف اور بعض پہلوؤں سے اس کے مشابہ نظر آتا ہے۔ یہ معاملہ' ربا کے معاملہ سے متغائر اور مختلف ہے۔ اس کی کچھ تفصیل پہلے عرض کی جا چکی ہے جہاں بعض اہل علم کے اس موقف کی تردید و تغلیط کی گئی ہے جو اس معاملہ کو ربا کا معاملہ کہتے اور اس کے حرام ہونے کے قائل ہیں۔ اس تفصیل میں دونوں کے درمیان جو بنیادی فرق بتلایا گیا وہ یہ کہ معاملہ ربا میں ایک فریق اپنا جو مال دوسرے کو استعمال کے لئے دیتا ہے وہ قرض کی وجہ سے دوسرے کی ملکیت میں منتقل ہو جاتا اور اس کو اس میں ہر مالکانہ تصرف کا اختیار ہوتا ہے بخلاف معاملہ کرایہ داری کے کہ اس میں ایک فریق اپنی جو چیز استعمال کے لئے دیتا ہے وہ چیز اسی کی ملکیت میں رہتی ہے دوسرے کی ملکیت میں منتقل نہیں ہوتی لہٰذا وہ اس میں کوئی مالکانہ تصرف نہیں کر سکتا'

اور دوسرا فرق یہ کہ ربا کے معاملہ میں استعمال کرنے کے بعد اصل مال اس کے پہلے مالک یعنی قرض دینے والے کی طرف جب لوٹتا ہے تو وہ بلا کسی کمی و نقصان کے پورے کا پورا لوٹتا ہے حالانکہ کرایہ داری کے معاملہ میں کرایہ دار کے استعمال کے بعد جب کرائے والی چیز اپنے مالک کی طرف لوٹتی ہے تو وہ کمی و نقصان کے ساتھ واپس لوٹتی ہے' علاوہ ازیں ربا کے معاملہ میں قرض کے اصل مال پر جو زائد مال لیا جاتا ہے وہ بلا کسی مالی عوض اور بغیر کوئی نقصان برداشت کرنے کے ہوتا ہے جبکہ کرایہ داری کے معاملہ میں اصل شے پر جو زائد مال وصول کیا جاتا ہے وہ اس نقصان کے عوض ہوتا ہے جو استعمال کرنے سے کرائے والی چیز کے اندر ضرور واقع ہوتا ہے۔ اب اس پہلو کو لیجئے جس کی وجہ سے معاملہ کرایہ داری' معاملہ ربا کے مشابہ و مماثل ہو جاتا ہے وہ یہ کہ معاملہ کرایہ داری میں عام طور پر جو کرایہ مقرر کیا جاتا ہے وہ مقدار میں اس نقصان سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جو استعمال سے کرائے والی شے کی مالیت اور قیمت میں واقع ہوتا ہے چنانچہ کرائے والی چیز مثلاً مکان کا مالک اپنے نقصان سے جو زائد لیتا ہے وہ چونکہ بلا کسی مادی اور مالی عوض کے ہوتا ہے لہٰذا وہ اس زائد مال کی طرح ہوتا ہے جو معاملہ ربا میں مقرض اپنے اصل مال کے ساتھ اپنے مقروض سے ضرور لیتا ہے' دونوں کے درمیان جو فرق ہے وہ یہ کہ معاملہ ربا کی جو حقیقت و ماہیت ہے بطور جز کے' اس میں اصل پر زائد کا لینا شامل ہے چنانچہ معاملہ ربا کی کوئی شکل بھی ایسی نہیں ہو سکتی جس میں اصل پر کچھ نہ کچھ زائد موجود نہ ہو بخلاف معاملہ کرایہ داری کے کہ اس میں اصل پر زائد کا موجود ہونا لازمی و ضروری نہیں یعنی کرائے کی بعض شکلوں میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کرائے کی مقدار' اس نقصان سے کم یا اس کے برابر ہو جو استعمال سے کرائے والی چیز کی مالیت میں واقع ہوا ہے' لہٰذا بحیثیت نفس معاملہ کے معاملہ کرایہ داری کا شرعی حکم وہ نہیں ہو سکتا جو معاملہ ربا کا ہے۔ یعنی قطعی حرام۔

نتیجہ یہ کہ قرآن مجید کی مذکورہ آیت کی روشنی میں معاملہ کرایہ داری نہ معاملہ بیع کی طرح قطعی حلال و جائز ہے اور نہ ربا کی طرح قطعی حرام معاملہ قرار پاتا ہے بلکہ دونوں کے بین بین ایک مشتبہ اور مکروہ معاملہ قرار پاتا' اور ایسے معاملات کی فہرست میں آتا ہے جن کا ایک حدیث نبوی میں واضح طور پر ذکر ہے۔ وہ حدیث نبوی' اس طرح ہے :

عن نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ قال سمعتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان الحلال بین وان الحرام بین وبینھما امور مشتبھات لایعلمھا کثیر من الناس' فمن اتقی الشبھات استبرأ لدینہ وعرضہ' ومن وقع فی الشبھات وقع فی الحرام۔ (سنن ابی داؤد)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ بے شک حلال بھی بین اور واضح ہے اور حرام بھی بین و واضح' البتہ ان کے درمیان کچھ امور و معاملات ہیں جو مشتبہ ہیں۔ (ان کے حلال و حرام ہونے میں شبہ پایا جاتا ہے) لہٰذا بہت سے لوگ یا لوگوں کی کثیر تعداد ان کو نہیں جانتی اور ان کی شرعی حیثیت کا علم نہیں رکھتی۔ پس جو ان کے اختیار کرنے سے بچا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت و آبرو کو عیب و خرابی سے محفوظ کر لیا اور جو ان میں پڑا وہ حرام میں پڑ کر رہا۔

اس حدیث نبوی سے جس کو محدثین نے صحیح تسلیم کیا ہے' صاف ظاہر ہوتا ہے کہ معاشی معاملات کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو بین اور واضح طور پر حلال و جائز ہیں۔ دوسرے وہ جو بین اور کھلے طور پر حرام ہیں اور تیسری قسم کے وہ جن کا حلال و حرام ہونا بین و واضح نہیں بلکہ مشتبہ ہوتا ہے۔ یعنی ان کے حلال ہونے کا بھی شبہ ہوتا ہے اور حرام ہونے کا بھی شبہ ہوتا ہے۔ گویا ایک پہلو سے وہ حلال و جائز لگتے ہیں اور دوسرے پہلو سے حرام و ناجائز دکھائی دیتے ہیں' اور پھر اس تیسری قسم کے معاشی امور و معاملات کے متعلق فرمایا ان سے بچنا دین کے لئے مفید اور بہتر ہے اور ان میں پڑنا خطرناک ہے' اور چونکہ علم اصول الفقہ کی رو سے مکروہ وہ ہوتا ہے جس کا نہ کرنا کرنے سے بہتر ہو اور جس کی ضد مستحب ہے کیونکہ اس کا کرنا نہ کرنے سے بہتر ہوتا ہے۔ لہٰذا بغور دیکھا جائے تو زیر بحث کرایہ داری کا معاملہ' مکروہ کی تعریف میں آتا ہے جس کا کرنا گرچہ حرام نہیں لیکن غیر پسندیدہ ضرور ہوتا ہے۔

اب میں قرآن مجید کی اس دوسری آیت کی طرف آتا ہوں جس سے زیر بحث کرایہ داری کے معاملہ کی شرعی حیثیت پر روشنی پڑتی ہے' سورۃ النساء کی وہ آیت پہلے نقل کر دی

گئی ہے اب میں اس کی تفسیر عرض کرتا ہوں۔ اس قرآنی آیت میں مومنوں کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طور پر نہ کھاؤ۔ یعنی باطل طریقہ سے نہ لو سوائے ایک طریقہ کے جو ایسی تجارت کا طریقہ ہے جس میں فریقین کی حقیقی رضامندی پائی جاتی ہو۔ اس آیت میں جو لفظ "باطل" ذکر ہوا ہے جب تک اس کا مفہوم و معنی واضح نہ ہو' آیت کا صحیح مطلب واضح نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا عرض ہے کہ مفسرین کرام نے اس آیت کی تفسیر میں باطل کے معنی بغیر حق' بدون مقابل اور بلا عوض لکھے ہیں۔ امام فخر الدین الرازی نے اپنی تفسیر الکبیر میں حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ اور حضرت حسنؒ بصری کا یہ قول بھی نقل فرمایا ہے :

"الباطل هو كل ما يوخذ من الانسان بغير عوض"

باطل ہر وہ مال ہے جو کسی انسان سے بغیر عوض کے لیا جائے۔

تفسیر المنار میں باطل کے متعلق لکھا ہے :

"اما الباطل ما لم يكن في مقابلته شيء حقيقي"

باطل وہ ہے جس کے مقابلہ میں کوئی حقیقی شے موجود نہ ہو۔

چنانچہ انہوں نے ایسے تمام اموال کو باطل سے تعبیر کیا ہے جو ربا' قمار' سرقہ' رشوت' غصب اور خیانت سے حاصل کئے گئے ہوں کیونکہ وہ بغیر مقابل اور عوض کے ہوتے ہیں' اور چونکہ مذکورہ سب طریقوں میں باطل ضرور موجود ہوتا ہے' لہٰذا یہ طریقے باطل کی تعریف میں آتے اور اس کا مصداق ٹھہرتے ہیں۔ گویا ان کے حرام ہونے کی وجہ ان کے اندر باطل کا پایا جانا ہے۔

یہ جو عرض کیا گیا ہے آیت زیر بحث کے پہلے حصے سے متعلق ہے۔ دوسرے حصہ میں لین دین کے جس طریقہ کو باطل سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے وہ باہمی رضامندی پر مبنی تجارت کا طریقہ ہے کیونکہ اس میں ہر فریق کے لئے اس کی چیز کا عوض موجود ہوتا ہے' بائع یعنی فروخت کنندہ کے لئے ثمن و قیمت کی شکل میں اور مشتری یعنی خریدار کے لئے اس کی مطلوبہ کسی شے کی شکل میں' پھر اگر خرید و فروخت کا یہ معاملہ عدل و قسط کے مطابق ہو تو ہر فریق کو اس کی چیز کا عوض' قدر و قیمت کے لحاظ سے پورا اور برابر ملتا ہے جو اس کی حقیقی رضامندی کی دلیل اور علامت ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ معاملہ' شریعت اسلامی کی رو سے بالکل

صحیح اور مطابق حق معاملہ ہوتا ہے' اور چونکہ ہر فریق کی حقیقی رضامندی کی دلیل اور علامت' اس کو اس کی چیز کا پورا عوض مل جانا ہے لہٰذا معاملہ خرید و فروخت کی وہ شکلیں فاسد قرار پاتی اور شرعاً ناجائز ٹھہرتی ہیں جن میں جھوٹ' دھوکے اور خیانت وغیرہ کی وجہ سے ایک فریق کو اس کی چیز کا عوض پورا نہیں بلکہ کم و ادھورا ملتا ہے جو اسکی عدم رضامندی کی دلیل ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں یہ جو فرمایا گیا ہے : جیسے ﴿وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ﴾ (الانعام : ۱۵۲) "اور ماپ تول انصاف کے ساتھ پورا کرو"۔ اور یہ کہ ﴿فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاءَ هُمْ﴾ (الاعراف : ۵۸) "پس پورا دو ماپ اور تول اور لوگوں کی اشیاء میں کمی نہ کرو"۔ اور یہ کہ ﴿وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ﴾ (الاسراء : ۳۵) "اور جب ماپو تو پورا ماپو اور سیدھی اور درست ترازو کے ساتھ وزن کرو"۔ اور یہ کہ ﴿وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ﴾ (ہود : ۸۴) "اور ماپ تول میں کمی نہ کرو"۔ اور یہ کہ ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝﴾ (المطففین : ۱-۳) "خرابی ہے ان گھٹانے والوں کے لئے جو جب ماپ کر لیں لوگوں سے تو پورا پورا لیں اور جب دوسروں کو ماپ کر اور تول کر دیں تو اس میں کمی کریں"۔

اس طرح کی قرآنی آیات کا صاف مطلب یہ ہے کہ خرید و فروخت کے معاملہ میں ہر فریق کو اس کی چیز کا عوض ٹھیک ٹھیک اور پورا پورا ملے کیونکہ ایسے معاملے کی صحت کے لئے فریقین کی جس رضامندی کا وجود ضروری ہے وہ اسی صورت میں موجود ہوتی ہے جب ہر فریق کو اس کی چیز کا عوض ٹھیک ٹھیک اور پورا پورا ملتا ہے۔ اور ماپ تول وغیرہ کے معروف پیمانوں کے ذریعے اس کا فریقین کو علم ہوتا ہے۔

بنابریں زیر بحث آیت قرآنی کے اندر جو معاشی اصول اور کلی ضابطہ بیان فرمایا گیا ہے اس کو اردو میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے! لین دین کا ہر وہ معاشی معاملہ باطل و ناجائز ہے جس میں ایک فریق کو اس کی چیز کا عوض ملتا ہی نہ ہو یا عوض تو ملتا ہو لیکن قدر و قیمت کے لحاظ

سے پورا اور مساوی نہ ملتا ہو۔ لہٰذا ایک مومن و مسلم کو اس سے بچنا اور پرہیز کرنا چاہئے!

چنانچہ اس اصولی تصور اور ضابطے کی روشنی میں جب ہم کرایہ داری کے معاملہ کا بغور جائزہ لیتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ اس معاملہ میں اگرچہ ہر فریق کے لئے اس کی چیز کا عوض موجود ہوتا ہے لیکن وہ عوض ایسا نہیں ہوتا جس کے متعلق وثوق و یقین ہو کہ وہ قدر و قیمت کے لحاظ سے برابر اور مساوی عوض ہے۔ کیونکہ جیسا کہ کچھ پہلے قدرے تفصیل کے ساتھ عرض کیا جا چکا ہے کہ اس معاملہ میں جس چیز کی خرید و فروخت ہوتی ہے ناپ تول وغیرہ کے کسی پیمانے سے اس کی مقدار کا صحیح تعین نہیں ہو سکتا لہٰذا اس کی مقدار ہمیشہ مجہول اور غیر متعین رہتی ہے۔ لہٰذا یہ معاملہ نہ تو اس طرح کا قطعی حلال معاملہ قرار پایا ہے جس میں ہر فریق کے لئے معروف پیمانوں کے مطابق برابر اور مساوی عوض موجود ہوتا ہے' جیسے بیع و شراء کا معاملہ' اور نہ اس طرح کا قطعی حرام معاملہ قرار پاتا ہے جس میں ایک فریق کے لئے اس کی چیز کا عوض بالکل موجود ہی نہیں ہوتا جیسے ربا کا معاملہ' بلکہ یہ ایک ایسا معاملہ قرار پاتا ہے جس میں حلال و حرام' دونوں کے ہونے کا احتمال ہوتا ہے اور جو ایک مشتبہ اور مکروہ معاملہ کی تعریف میں آتا ہے۔ یعنی جائز تو ہوتا ہے لیکن کراہیت کے ساتھ اور جس کا اختیار نہ کرنا اختیار کرنے سے بہتر ہوتا ہے۔

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ کرایہ داری کے معاملہ میں جس منفعت یا جس کرائے والی چیز کی مالیت میں واقع ہونے والی کمی کی خرید و فروخت ہوتی ہے وہ مقدار کے لحاظ سے مجہول رہتی ہے اور یہ کہ اس کی خرید و فروخت محض تخمینے سے ہوتی ہے اور محض اندازے اور تخمینے سے کسی چیز کو بیچنے خریدنے کی بعض احادیث نبویہ میں صاف ممانعت ہے۔ مثلاً صحیح المسلم کی ایک حدیث اس طرح ہے۔

عن جابر رضی اللہ عنہ قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع الصبرۃ من التمر لا یعلم مکیلتھا بالکیل المسمی من التمر

"حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ چھوہاروں کے ایسے ڈھیر کو جس کی مقدار ماپ کے لحاظ سے معلوم نہ ہو ایسے چھوہاروں کے بدلہ میں بیچا خریدا جائے جن کی مقدار ماپ کے پیمانے کے لحاظ سے

متعین ہو"۔

ایک دوسری حدیث سنن النسائی میں بایں طور ہے :

عن جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ یقول قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لاتباع الصبرۃ من الطعام بالصبرۃ من الطعام ولا الصبرۃ من الطعام بالکیل المسمی من الطعام

"حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا غلے کا ڈھیر غلے کے دوسرے ڈھیر کے عوض نہ بیچا خریدا جائے۔ اسی طرح غلے کا ڈھیر جس کی مقدار متعین نہ ہو ایسے غلے کے عوض نہ فروخت کیا جائے جس کی مقدار متعین و معلوم ہو"۔

علاوہ ازیں اور بھی بہت سی احادیث نبویہ ہیں جن میں ایسی بیوع سے روکا اور منع فرمایا گیا ہے جن میں مبیع یا ثمن کی مقدار متعین نہ ہو' مجہول ہو کیونکہ ایسی بیوع میں اس کا احتمال رہتا ہے کہ ایک فریق کو اس کی چیز کا مساوی اور برابر عوض نہ ملے اور اس کی حق تلفی واقع ہو' بالفاظ دیگر چونکہ ایسے معاملات عدل کے مطابق طے نہیں ہوتے لہٰذا ان سے منع فرمایا گیا ہے۔

مطلب یہ کہ قرآن مجید کی مذکورہ دو آیات سے معاملہ اجارہ یعنی کرایہ داری کی شرعی حیثیت پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی طرح احادیث نبویہ سے بھی اس معاملہ کے شرعی حکم کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

یہاں فقہاء کرام کے وضع کردہ ایک قاعدہ کلیہ کا ذکر بھی مناسب و مفید سمجھتا ہوں جو معاملہ زیر بحث کی شرعی حیثیت سے تعلق رکھتا اور اس کے تعین میں مدد دیتا ہے۔ وہ قاعدہ کلیہ اس طرح ہے : "الجھل بالمماثلۃ کالعلم بالمفاضلۃ" یا : "الجھل بالتساوی کالعلم بالتفاضل۔" معمولی سے لفظی اختلاف کے ساتھ مفہوم و مطلب دونوں کا ایک ہے اور وہ یہ کہ تبادلہ کی دو چیزوں کے مابین قدر و قیمت کے لحاظ سے برابری اور مساوات کا مجہول و نامعلوم ہونا گویا ان کے مابین کمی و زیادتی کا

معلوم ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر مطلب یہ کہ جس طرح بیع و شراء کا وہ معاملہ درست نہیں ہوتا جس کے اندر فریقین کو یہ علم ہو کہ تبادلہ کی اشیاء کے مابین قدر و قیمت کے لحاظ سے بجائے برابری کے کمی و بیشی ہے اسی طرح معاملہ کی وہ صورت بھی درست نہیں ہوتی جس کے اندر تبادلہ کی اشیاء کے مابین مساوات و برابری مجہول و نامعلوم ہو۔ یعنی اس کا علم ہو ہی نہ سکتا ہو۔ مذکورہ قاعدہ کلیہ کی رو سے معاملہ کی مذکورہ دونوں شکلوں کا شرعی حکم ایک اور یکساں ہے۔

مذکورہ فقہی قاعدہ کلیہ کی رو سے کرایہ داری کا معاملہ اس وجہ سے ناجائز قرار پاتا ہے کہ اس کے اندر مبیع اور ثمن کے مابین مساوات و مماثلت ہمیشہ مجہول رہتی ہے جیسا کہ پہلے تفصیل کے ساتھ عرض کیا گیا گویا اس کے اندر یہ علم موجود ہوتا ہے کہ معاملہ کمی و زیادتی کے ساتھ ہو رہا ہے جو شرعاً درست نہیں ہوتا بلکہ فاسد ہوتا ہے۔

یہاں ایک چیز کی وضاحت نہایت ضروری ہے وہ یہ کہ ہمارے ہاں اردو زبان میں اس معاوضے کو بھی کرایہ کہا جاتا ہے جو مختلف سواریوں مثلاً ٹیکسیوں، بسوں، ریلوں، بحری اور ہوائی جہازوں میں سفر کرنے والے مسافر ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح اس معاوضے کو بھی کرائے کا نام دیا جاتا ہے جو رہائشی ہوٹلوں میں وقتی قیام کرنے والے اشخاص ہوٹل انتظامیہ کو اپنے قیام کے بدلے دیتے ہیں حالانکہ یہ معاوضہ اس کرائے کی تعریف میں نہیں آتا جو اس مضمون میں ہمارے زیر بحث ہے اور جس کی شرعی حیثیت کا تعین ہمارا مقصود ہے کیونکہ یہ معاوضہ دراصل ان مختلف قسم کی خدمات اور مساعی کا معاوضہ ہوتا ہے جو بہت سے انسان انجام دیتے اور عمل میں لاتے ہیں، اسی طرح یہ معاوضہ ان گوناگوں مالی اخراجات کا معاوضہ ہوتا ہے جو مذکورہ چیزوں کے مالک ان کے متعلق اپنی جیب سے برابر اٹھاتے رہتے ہیں۔ ٹرانسپورٹ کا کاروبار کرنے والے اداروں میں بہت سے لوگ ہوتے جو مختلف نوعیت کے کام کرتے اور اپنے کاموں کا یومیہ اجرتوں یا ماہانہ تنخواہوں کی شکل میں معاوضہ لیتے ہیں اور یہ معاوضہ مالکان ادارہ ادا کرتے ہیں اور وہ خود بھی بہت سے کام انجام دیتے ہیں۔ ریلوے اور بحری اور ہوائی جہازوں کی کمپنیوں میں مختلف نوعیت کے کام کرنے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے اور مجموعی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ان میں تقسیم ہوتا

ہے۔اسی طرح کوئلہ 'ڈیزل' پیٹرول 'گیس 'بجلی 'فاضل پرزہ جات وغیرہ کی خریداری پر جو مالی اخراجات ہوتے ہیں ان کو بھی ٹرانسپورٹ کمپنیوں اور اداروں کے مالکان برداشت کرتے ہیں لہٰذا سفر کرنے والے مسافروں سے یا تجارتی اشیاء اور ساز و سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے والے تاجروں سے جو معاوضہ لیا جاتا ہے 'اس کا تعلق مشینوں کی گھسائی سے نہیں ہوتا بلکہ مذکورہ انسانی خدمات اور مالی اخراجات سے ہوتا ہے بنابریں اس کو کرایہ کہنا حقیقت حال کی غلط ترجمانی ہے۔ دراصل اردو میں دوسرا کوئی ایسا لفظ موجود نہیں جو اس کی جگہ استعمال ہو سکتا ہے ہو۔

پھر جس طرح ٹرانسپورٹ سے تعلق رکھنے والے معاوضہ کو غلط طور پر کرایہ کہا جاتا ہے اسی طرح اس معاوضہ کو بھی کرایہ ہی کہا جاتا ہے جو مختلف قسم کے رہائشی ہوٹلوں کے کمروں میں عارضی قیام کے بدلے قیام کرنے والے مسافر وغیرہ ادا کرتے ہیں۔ حالانکہ اس معاوضے کا تعلق بھی محض کمرے سے نہیں ہوتا بلکہ ان خدمات سے ہوتا ہے جن کو ہوٹل کی انتظامیہ اپنے بہت سے افراد کے ذریعے انجام دیتی ہے نیز ان مالی اخراجات سے ہوتا ہے جو انتظامیہ فرنیچر 'بجلی 'گیس 'پانی اور صفائی وغیرہ کے سلسلہ میں اپنے پاس سے برداشت کرتی ہے لہٰذا یہ معاوضہ اس معاوضے کی طرح نہیں ہوتا جو محض مکان کے استعمال کرنے کے بدلے استعمال کرنے والے سے بطور کرایہ لیا دیا جاتا ہے۔ دوسرا فرق یہ کہ رہائشی ہوٹلوں کے کمرے 'جن میں مسافر ٹھہرتے اور اس کے بدلے معاوضہ ادا کرتے ہیں وہ کمرے ہوٹل انتظامیہ کی تحویل و نگرانی میں رہتے اور وہی ان کی دیکھ بھال اور صفائی و درستگی کی ضامن و ذمہ دار ہوتی ہے۔ جبکہ کرائے کا مکان کرایہ دار کی تحویل و نگرانی میں رہتا ہے۔ وہی اس کی دیکھ بھال 'درستگی وصفائی وغیرہ کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کی چابی اسی کے پاس ہوتی ہے۔ جبکہ ہوٹل کے کمرے کی ایک چابی مالک اور انتظامیہ کے پاس بھی ضرور رہتی ہے۔ اس فرق کی وجہ سے دونوں کے معاوضے کی شرعی حیثیت یکساں نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ ہوٹل میں قیام کا معاوضہ بلا کسی کراہیت کے جائز ہوتا ہے۔

ٹرانسپورٹ سے مثال دینی ہو تو اس طرح دی جاسکتی ہے کہ ایک شخص گاڑی کا مالک تو

ہوتا ہے لیکن بطور ٹیکسی اس کو خود نہیں چلاتا بلکہ کسی دوسرے کو اس طرح دے دیتا ہے کہ وہ اس کو بطور ٹیکسی استعمال کرے اور پٹرول وغیرہ کے جملہ اخراجات بھی خود اٹھائے اور اس کو گاڑی کے استعمال پر ہر روز یا ہر ہفتہ اور مہینہ اتنی رقم ادا کرتا رہے تو معاملے کی یہ صورت بلاشبہ اس کرایہ داری کی صورت ہے جو ہمارے زیر بحث ہے' لیکن یہ دوسرا شخص یا اصل مالک اپنی گاڑی بطور ٹیکسی خود چلا کر سواریوں سے سواری کے عوض جو مال لیتا ہے وہ زیر بحث کرایہ کی تعریف میں نہیں آتا کیونکہ وہ ڈرائیور وغیرہ کی جسمانی خدمت اور ان مالی اخراجات کا معاوضہ ہوتا ہے جو پٹرول وغیرہ کے سلسلہ میں برداشت کئے جاتے ہیں' لہٰذا پہلی شکل میں گاڑی کا مالک جو معاوضہ لیتا ہے اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ وہ کراہیت کے ساتھ جائز ہوتا ہے جبکہ سواریوں سے جو معاوضہ لیا جاتا ہے بلا کسی کراہت کے جائز ہوتا ہے۔

بہرحال اس قسم کے معاشی معاملات جن میں ہر فریق کے حق کا صحیح صحیح تعین نہیں ہو سکتا چونکہ ان میں کسی ایک فریق کی حق تلفی کا ضرور احتمال رہتا ہے لہٰذا اس احتمال کی وجہ سے وہ قطعی حرام تو نہیں ہوتے لیکن مکروہ ضرور ہوتے ہیں۔ اسلام اس قسم کے معاملات کو معاشرے کے مخصوص ذہنی و خارجی حالات کی وجہ سے اختیار کرنے کی اجازت تو ضرور دیتا ہے لیکن ان کو ہمیشہ قائم رکھنا اور رواج دینا پسند نہیں کرتا کیونکہ ایسے معاملات کی موجودگی اور ان پر عام عمل درآمد سے معاشرے میں وہ معاشی اعتدال و توازن پیدا نہیں ہو سکتا جو اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے اور جس پر پائیدار امن و اطمینان کا انحصار اور دارومدار ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے جس کا اظہار قرآن مجید کی بعض آیات سے ہوتا ہے کہ سلسلہ وحی و رسالت کے مقاصد میں سے ایک اہم ترین مقصد یہ ہے کہ یہاں دنیا میں ایک ایسا انسانی معاشرہ عمل میں آئے جو کامل طور پر عدل و قسط پر قائم ہو اور جس اندر ہر انسان کے ہر قسم کے حقوق ٹھیک ٹھیک اور پوری طرح محفوظ ہوں کیونکہ دراصل ایک ایسے ہی عادلانہ معاشرے میں ہر فرد کو پائیدار امن و اطمینان کی وہ خوشگوار زندگی نصیب ہو سکتی ہے جس کی ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر طلب و خواہش پائی جاتی ہے۔ اور جس کو قرآن حکیم نے حیات طیبہ' حسنہ اور عیشۃ راضیۃ وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے اور اس کے حاصل ہو جانے کو انسان کی فوز و فلاح بتلایا ہے۔

سلسلہ وحی و رسالت کی آخری اور مکمل ترین کڑی قرآن مجید اور حضرت محمد رسول اللہ کی رسالت ہے۔ لہٰذا اس کا بھی اہم ترین مقصد بنی نوع انسان کو ان اعتقادی اور عملی حقائق سے آگاہ کرنا ہے جن پر اعتقاد اور عمل سے لازماً ایک ایسا معاشرہ وجود میں آسکتا ہے جس کے ہر پہلو میں عدل و قسط پایا جاتا ہو اور جس میں ہر فرد کے لئے پائیدار امن و اطمینان کی ضمانت ہو۔ بنابریں قرآن مجید اور محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھنے والوں پر لازم آتا ہے کہ وہ قرآن و حدیث کی ہدایات و تعلیمات کے ذریعے معاشرے میں قیام عدل کی بھرپور کوشش کریں' ایسے معاملات کو رواج دینے اور ان پر عمل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں جن میں ہر فریق کو اس کا حق ٹھیک ٹھیک اور پورا پورا ملتا ہو اور ایسے معاملات سے پرہیز اور گریز کریں جن میں ہر فریق کے حق کا صحیح صحیح تعین نہ ہو سکتا اور ایک فریق کی حق تلفی کا ضرور احتمال رہتا ہو' اور چونکہ زیر بحث کرایہ داری کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے جس میں ہر فریق کے حق کا صحیح تعین نہ ہو سکنے کی وجہ سے ایک فریق کی حق تلفی کا احتمال بہرحال موجود رہتا ہے اور چونکہ اس قسم کی مشتبہ اور مکروہ معاملات اس وقت خود بخود ختم ہو جاتے ہیں جب معاشرے میں خاص طرح کے حالات وجود میں آتے ہیں' لہٰذا مسلمانوں کی یہ منصبی ذمہ داری قرار پاتی ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں جن کے پیدا ہو جانے سے مذکورہ قسم کے معاملات ختم ہو سکتے ہیں مثلاً مکانات کی کرایہ داری کا معاملہ اس حالت میں خود بخود ختم ہو جاتا ہے جب معاشرے کے ہر فرد کے پاس اپنا ذاتی مکان ہو اور ایسا یقیناً ہو سکتا ہے جب باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت سنجیدگی کے ساتھ کوشش کی جائے۔ دنیا میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور جیسا کہ میں نے اسی مضمون میں پہلے ایک جگہ عرض کیا کہ روٹی کپڑے کی طرح مکان بھی ہر انسان کا بنیادی حق ہے جو اس کے لئے ہر حال میں محفوظ ہونا چاہئے۔ عہد حاضر کے اسلامی ممالک میں لیبیا ایسا ملک ہے جس کے اندر ہر شہری کے لئے رہائشی مکان مہیا کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ چنانچہ وہاں مکانات کی کرایہ داری کا مسئلہ تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے مسلم ممالک میں دیر سویر ایسا نہ ہو سکے۔

اسی طرح کچھ اور معاشی معاملات بھی ایسے ہیں جو مسلمان معاشروں میں بعض

مخصوص حالات کی وجہ سے رائج ہیں۔ چنانچہ جب وہ مخصوص حالات ختم ہو جائیں گے تو یہ معاشی معاملات بھی خود بخود ختم اور ناپید ہو جائیں گے۔ مثلاً مضاربت کا تعلق اس مخصوص حالت سے ہے کہ جب معاشرے کے بعض افراد تجارت کا کام کر سکتے اور کرنا چاہتے ہوں لیکن ان کے پاس سرمایہ نہ ہو اور دوسرے بعض افراد ایسے ہوں کہ ان کے پاس تجارت کے لئے سرمایہ تو ہو لیکن وہ کسی عذر کی وجہ سے مثلاً بچپنے بڑھاپے اور بیماری وغیرہ کی بنا پر کار تجارت خود نہ کر سکتے ہوں اور ان کو اندیشہ ہو کہ خرچ کرتے کرتے ان کا مال ختم ہو گیا تو معاشرے میں کوئی ان کا پرسان حال نہ ہو گا۔ ایسی حالت میں مذکورہ دونوں (فریقین) کا مسئلہ مضاربت سے حل ہو جاتا ہے جو عقلاً اس کے جواز پر دلالت کرتا ہے' لیکن جب حالت ایسی ہو جائے کہ ہر تجارت کرنے والے کے پاس حسب ضرورت اپنا سرمایہ موجود ہو یا اس کو صدقے اور قرض حسن کے طور پر مل سکتا ہو' اور دوسری طرف معاشرے میں معذور محتاج افراد کی معاشی کفالت کا بندوبست ہو تو مضاربت کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی اور اس کا ختم ہو جانا قدرتی امر ہے۔ اسی طرح جب ہر کاشتکار کے پاس کاشت کے لئے بقدر ضرورت اپنی زمین موجود ہو تو مزارعت و بٹائی کا معاملہ خود بخود ختم ہو جاتا اور دم توڑ دیتا ہے' کیونکہ مزارعت کی حاجت ہی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کاشتکار کے پاس کاشت کے لئے اپنی زمین موجود نہیں ہوتی' پھر ہر کاشتکار کے پاس کاشت کے لئے اپنی زمین کا موجود ہونا بھی کوئی ایسی چیز نہیں جو نہ ہو سکتی ہو۔ یقیناً یہ ہو سکتی ہے جب پختہ عزم اور صحیح طریقہ سے اس کے لئے کوشش کی جائے۔ کئی ممالک میں یہ چیز موجود ہے۔ وہاں کاشتکار مزارعت یعنی پیداوار زمین کے ایک حصہ پر کاشتکاری کا کام نہیں کرتا۔

آخر میں ایک بات واضح کر دینا انتہائی ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ کہ معاملہ کرایہ داری کے متعلق اس مضمون کے اندر میں نے اپنا جو موقف بیان کیا ہے کہ یہ معاملہ اصولی طور پر جائز تو ہے لیکن کراہت کے ساتھ' تو یہ اس صورت میں ہے جب کرائے کی مقدار تقریباً اتنی ہو جتنی استعمال کرنے سے کرائے والی چیز کی قدر و قیمت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ تقریباً کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ کمی کی مقدار کا کسی طریقہ اور کسی پیمانے سے صحیح اور پورا تعین نہیں ہو سکتا لیکن جب کرائے کی مقدار' واقع ہونے والی کمی کے مقابلہ میں

بہت ہی زیادہ ہو جیسا کہ آج عام طور پر ہے۔ آج شہروں میں عام طور پر کرائے کی مقدار اتنی زیادہ ہے کہ چند سالوں میں مالک مکان کو مکان کی پوری قیمت وصول ہو جاتی اور مکان بھی اس کی ملکیت میں محفوظ رہتا ہے۔ بعض لوگ کرایہ مقرر کرنے میں بینک کی شرح سود کو سامنے رکھتے ہیں۔ مثلاً مکان ایک لاکھ روپے کی قیمت کا ہے تو وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اگر ایک لاکھ روپے بینک میں رکھے جاتے تو ماہانہ یا سالانہ کتنا سود ملتا' پھر اس کے مطابق کرایہ مقرر کرتے ہیں۔ جائزہ لیا جائے تو اس طرح کی کرایہ داری کے معروضی نتائج اور سودی کاروبار کے معروضی نتائج کے درمیان کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ دونوں کے ذریعے غیر متوازن معاشی ماحول وجود میں آتا ہے۔ بعض افراد کے پاس بغیر کسی پیداآور دماغی و جسمانی محنت و مشقت کے شخصی دولت و ثروت میں برابر اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور دوسرے بعض شب و روز کی محنت و مشقت کے باوجود غربت و ناداری میں گھرے پریشان حال رہتے ہیں۔ ان کی معاشی حالت جوں کی توں رہتی یا دن بدن بگڑتی چلی جاتی ہے۔ بنابریں میں مذکورہ بالا شکل کی کرایہ داری کو منشائے اسلام کے سراسر خلاف اور بالکل غلط و باطل سمجھتا ہوں۔ اگر کسی مسلم ملک و معاشرے میں صحیح اسلامی حکومت ہو جس کی اصل ذمہ داری عدل کا قیام ہے تو اس کا فریضہ قرار پاتا ہے کہ ایسے قوانین وضع کر کے ان کا نفاذ عمل میں لائے جن سے مذکورہ کرایہ داری کا خاتمہ ہو سکتا ہو۔ چونکہ اس کا کلی طور پر خاتمہ بتدریج ہی ہو سکتا ہے جو دانشمندانہ منصوبہ بندی کے ساتھ طویل وقت چاہتا ہے لہٰذا اس کے لئے پہلے مرحلہ میں کرایہ کی مقدار کو گھٹانے اور کم سے کم کرنے کے لئے قانونی اقدامات کرنے ہوں گے یہاں تک کہ کرایہ داری کا دھندہ کرنے والے لوگ اس دھندہ کو خسارے کا دھندہ سمجھ کر چھوڑنے پر آمادہ اور مجبور ہو جائیں اور اپنے ایسے مکانات فروخت کرنے کا عزم و فیصلہ کر لیں۔ دوسرے مرحلہ میں حکومت ایسے قدم اٹھائے اور ایسے انتظامات کرے جن کے نتیجہ میں مالکان مکانات کو ان کے مکانات کا صحیح معاوضہ مل جائے اور کرایہ دار معاوضہ ادا کر کے مکانات کے مالک بن جائیں جو کرایہ دار معاوضہ ادا کرنے کی قدرت نہ رکھتے ہوں' حکومت بیت المال سے ان کے لئے قرضہ حسنہ کا بندوبست کرے اگر وہ آئندہ ادا کر سکنے کی پوزیشن میں ہوں ورنہ صدقہ اور عطیہ کے طور پر ان کی

امداد کی جائے۔ بہرکیف مالکان مکانات کو ان کے مکانات کا معاوضہ دلوانا ضروری ہو گا الا یہ کہ وہ اس سے خود رضاکارانہ طور پر دستبردار ہو جائیں اور معاف کر دیں کیونکہ ان کو احسان کے طور پر اس کا پورا اختیار ہے کہ اپنے حق کا دوسروں کے لئے ایثار کر دیں۔ غرضیکہ یہ مسئلہ ایسا نہیں جو حل نہ ہو سکتا ہو۔ اخلاص اور سنجیدگی کے ساتھ کوشش کی جائے تو ایک اسلامی معاشرے اور اسلامی حکومت میں یہ مسئلہ احسن طور پر حل ہو سکتا ہے۔

لیکن نہایت رنج و افسوس کی بات یہ ہے کہ آج عام طور پر مسلم ممالک اور معاشروں میں مذکورہ کرایہ داری کا معاملہ اس طرح سے رائج ہے کہ گویا یہ اللہ اور اس کے رسول کی منشاء کے مطابق اور قرآن و حدیث کی رو سے ایک بالکل درست اور مستحب معاملہ ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ کرائے کی مقدار پر شرعاً کوئی پابندی نہیں' مالک مکان جتنا چاہے کرایہ مقرر کر سکتا اور لے سکتا ہے۔ بدقسمتی سے بعض مفتیوں نے ایسا فتویٰ بھی دے رکھا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت حال میں ظاہر ہے کہ عام مسلمان معاملہ کرایہ داری کے متعلق اس رائے کو جو اس مضمون میں قرآن و حدیث کے واضح دلائل کی روشنی میں پیش کی گئی ہے' خوشی اور آسانی کے ساتھ نہ مان سکتے اور نہ اس پر عمل کر سکتے ہیں لیکن یہ جاننے کے باوجود میں نے اس معاملہ کے متعلق اس مضمون میں جو لکھا ہے اس کا مقصد اسلام کے حقیقی معاشی نظام کے بعض خدوخال اجاگر کرنا اور یہ بتلانا ہے کہ دوسرے کئی معاملات کی طرح اس معاملہ سے متعلق بھی ہم مسلمانوں کا عمل درآمد اس اسلام کے مطابق نہیں جو قرآن و حدیث میں پایا جاتا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ آج دنیا میں جتنے نام نہاد مسلم معاشرے اور اسلامی ممالک ہیں ان میں سے کسی کے اندر عملی شکل میں اسلام کا معاشی نظام موجود نہیں ہے اور جو معاشی نظام موجود ہے وہ مغرب کا سرمایہ دارانہ معاشی نظام ہے' جس کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے قرضوں پر سود کو جائز قرار دیتا ہے اور قانون کے ذریعے اس کا تحفظ کرتا ہے اور اس کی وجہ اس کا یہ اصولی تصور ہے کہ محنت کی طرح سرمایہ بھی مال و دولت کو پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ اس نظام کے اندر سرمایہ کاری کی جتنی بھی شکلیں ہیں ان میں سے ہر ایک کے اندر کم و بیش سود کا عنصر ضرور موجود ہوتا ہے۔ کرایہ داری بھی چونکہ

سرمایہ کاری کی ایک شکل ہے لہٰذا نظام سرمایہ داری میں وہ بھی سود سے خالی نہیں ہو سکتی۔ اس میں کرایہ داری کے متعلق جو بھی قوانین ہیں وہ لینڈ لارڈ یعنی مکان وغیرہ کے مالک کو یہ حق و اختیار دیتے ہیں کہ وہ جتنا چاہے کرایہ مقرر کر سکتا اور لے سکتا ہے۔ یعنی وہ اس کی کے مقابلہ میں کہیں زائد لے سکتا ہے جو استعمال ہونے سے اس کے مکان وغیرہ کی قدر و قیمت میں واقع ہوتی ہے۔ یہی قوانین بشمول پاکستان ان تمام ممالک میں نافذ اور رائج ہیں جن کا معاشی نظام سرمایہ دارانہ نوعیت کا ہے۔

دین اسلام میں معاشی حق اور معاشی عدل کا جو تصور ہے اس کے مطابق سرمایہ دارانہ نظام بحیثیت مجموعی اور اس کے بہت سے قواعد و قوانین غلط و باطل ہیں۔ لہٰذا ضروری اور لازمی ہے کہ مسلمان ممالک و معاشرے اپنے ہاں سے سرمایہ دارانہ معاشی نظام کو ختم کر کے اس کی جگہ اسلام کا عادلانہ معاشی نظام قائم کریں اور عمل میں لائیں جس کے ذریعے ایک معتدل و متوازن معاشی ماحول وجود میں آ سکتا ہے۔ ایسا معاشی ماحول جس کے اندر معاشرے کے ہر ہر فرد کو کسی نہ کسی شکل میں بالفعل وہ تمام معاشی ضروریات بھی میسر ہوتی ہیں جن کے بغیر عام طور پر ایک انسان نہ امن و اطمینان کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے اور نہ اپنے وہ متعلقہ فرائض و واجبات ٹھیک طریقہ سے انجام دے سکتا ہے جو مختلف حیثیات سے اس کے ذمہ پر عائد ہوتے ہیں اور جن کی ادائیگی اور انجام دہی پر معاشرے کے قیام و بقا اور اجتماعی امن و امان کا دارومدار ہوتا ہے۔

آخر میں تہہ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو اپنی مرضی کے مطابق ہر لحاظ اور ہر پہلو سے کامل اور صحیح اسلامی زندگی اختیار اور بسر کرنے کی خاص اور وافر توفیق عطا فرمائے! آمین۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

قرآن عکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔